ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2953

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(درس نظامی پروگرام)

کورس: اصول فقہ (2953) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (بوٹ: 1 تا 4)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — GUIDE SOLVED ASSIGNMENT

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: علم اصول فقہ کی تعریف، غرض وغایت اور تدوین کا ارتقاء (20 نمبر)

سوال نمبر 1: علم اصول فقہ کی تعریف، غرض وغایت اور تاریخ وارتقاء پر تفصیلی بحث کریں۔ نیز تدوین اصول فقہ میں علمائے متکلمین (طریقہ شافعیہ) اور فقہائے احناف کے اسالیب ومناہج کا باہمی موازنہ کریں۔ (20)

تعارف

علم اصول فقہ اسلامی علوم میں بنیادی اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ یہی وہ علم ہے جو قرآن و سنت سے احکام شرعیہ کے استنباط کے قواعد وضوابط سکھاتا ہے۔ فقہ عملی احکام کا مجموعہ ہے جبکہ اصول فقہ ان احکام تک پہنچنے کا طریقہ کار ہے، گویا فقہ پھل ہے اور اصول فقہ اس کی جڑ اور تنا۔ جب تک طالب علم ان قواعد سے واقف نہ ہو وہ نہ نصوص کو درست سمجھ سکتا ہے، نہ نئے پیش آمدہ مسائل میں شریعت کی رہنمائی تلاش کر سکتا ہے اور نہ فقہاء کے اختلاف کی اصل وجوہ کو جان سکتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اس سوال میں پہلے اس علم کی تعریف، موضوع، غرض و غایت بیان کی جائے گی، پھر اس کی تاریخ ارتقاء کے اہم ادوار کا جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں تدوین اصول فقہ کے دو مشہور اسالیب یعنی علمائے متکلمین کے طریقہ شافعیہ اور فقہائے احناف کے طریقے کا باہمی موازنہ پیش کیا جائے گا تاکہ دونوں مناہج کی خصوصیات اور ان کے باہمی تعلق کو پوری طرح سمجھا جا سکے۔

اصول فقہ کی لغوی و اصطلاحی تعریف

اصول جمع ہے اصل کی، جس کے لغوی معنی بنیاد اور جڑ کے ہیں، اور فقہ کے لغوی معنی سمجھ بوجھ اور کسی چیز کی گہرائی تک پہنچنے کے ہیں۔ اصطلاح میں اصول فقہ کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ وہ علم ہے جس میں ان قواعد و دلائل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے ذریعے قرآن و سنت کی تفصیلی دلیلوں سے عملی شرعی احکام کا استنباط کیا جاتا ہے۔ امام بیضاوی کی مشہور تعریف کے مطابق اصول فقہ ان دلائل اور ان طریقوں کی معرفت کا نام ہے جن کے ذریعے احکام تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ بعض علماء نے اسے یوں بیان کیا کہ یہ ان قواعد کا علم ہے جو مجتہد کو کتاب و سنت سے حکم شرعی اخذ کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اس تعریف سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں: پہلی یہ کہ اس علم کا مرکز و محور دلائل شرعیہ ہیں، دوسری یہ کہ اس کا مقصد محض نظری معلومات نہیں بلکہ استنباط کی عملی صلاحیت پیدا کرنا ہے، اور تیسری یہ کہ اس کا تعلق عملی احکام سے ہے، اعتقادی مسائل اصول دین اور علم کلام کا موضوع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصول فقہ کو فقہ کا دروازہ اور مجتہد کا اصل ہتھیار قرار دیا جاتا ہے۔

موضوع، غرض وغایت اور اس علم کی ضرورت

اصول فقہ کا موضوع دلائل شرعیہ اور احکام شرعیہ ہیں، یعنی یہ علم کتاب، سنت، اجماع اور قیاس جیسے مآخذ کا بھی جائزہ لیتا ہے اور حاکم، محکوم علیہ اور حکم کی اقسام جیسی مباحث بھی اسی کے دائرے میں آتی ہیں۔ اس کی غرض وغایت یہ ہے کہ قرآن وسنت کے خطابات کو ان کے درست مفہوم میں سمجھا جائے، تعارض نظر آنے والی نصوص میں تطبیق یا ترجیح دی جاسکے، اور جن مسائل میں صریح نص موجود نہ ہو ان میں نباط اور دیگر قواعد کی روشنی میں حکم معلوم کیا جاسکے۔ اس علم کی ضرورت اس لیے بھی مسلم ہے کہ نصوص محدود ہیں جبکہ پیش آمدہ مسائل غیر محدود ہیں؛ اگر استنباط کے باقاعدہ اصول نہ ہوں تو ہر شخص اپنی رائے کو دین بنالے گا اور شریعت میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ دوسری طرف ان اصولوں کی پابندی مجتہد کو من مانی سے بچاتی ہے اور اس کے استنباط کو دلیل کی بنیاد پر قابل جانچ بناتی ہے۔ طالب علم کے لیے بھی یہ علم فقہی اختلافات کو سمجھنے کی کنجی ہے، کیونکہ اکثر اختلافات نصوص میں نہیں بلکہ انہیں سمجھنے اور ان پر اصولوں کے اطلاق میں ہوتے ہیں۔

تاریخ وارتقاء: عہد نبوی سے تدوین تک

اصول فقہ کا سرچشمہ عہد نبوی ہی میں موجود تھا، اگرچہ اس وقت یہ ایک مدون علم کی صورت میں نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو مسائل کی علت سمجھاتے، ایک حکم کو دوسرے پر قیاس کرنے کی عملی مثالیں دیتے اور اجتہاد کی تربیت فرماتے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے ان سے پوچھا کہ فیصلہ کس بنیاد پر کروگے، انہوں نے ترتیب وار کتاب اللہ، سنت رسول اور پھر اپنی رائے سے اجتہاد کا ذکر کیا تو آپ نے اس کی تحسین فرمائی؛ یہ واقعہ اصول فقہ کی پوری ترتیب کی عملی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ عہد صحابہ میں قیاس، اجماع اور مصلحت کی روشن مثالیں ملتی ہیں، مثلاً قرآن مجید کی جمع وتدوین کا فیصلہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادی فیصلے اور اجتماعی مشاورت کے ذریعے مسائل کا حل۔ تابعین کے دور میں عراق وحجاز کے فقہی رجحانات نمایاں ہوئے اور استنباط کے اصول زبانی روایت اور عملی طرز سے اگلی نسل تک منتقل ہوتے رہے۔ دوسری صدی ہجری میں جب فقہی مسالک مدون ہوئے تو انہی اصولوں کو کتابی صورت دینے کی ضرورت پیش آئی۔

باقاعدہ تدوین اور اہم تصانیف

اصول فقہ کی پہلی باقاعدہ اور محفوظ تصنیف امام شافعی رحمہ اللہ کی کتاب الرسالہ سمجھی جاتی ہے، جس میں انہوں نے کتاب و سنت کے تعلق، ناسخ و منسوخ، عام و خاص، اجماع اور قیاس کے اصول منظم انداز میں بیان کیے؛ اسی بنا پر امام شافعی کو اس فن کا بانی و مدون کہا جاتا ہے۔ فقہائے احناف کے ہاں اصول کی تدوین کا آغاز امام ابو حنیفہ کے شاگردوں خصوصاً امام ابو یوسف اور امام محمد کی فقہی تصانیف سے ہوا، اور بعد ازاں امام عیسیٰ بن ابان، ابو الحسن کرخی اور ابو بکر جصاص جیسے علماء نے ان اصولوں کو صراحت کے ساتھ لکھا؛ جصاص کی الفصول فی الاصول اس سلسلے کی اولین نمایاں کتب میں سے ہے۔ بعد کے ادوار میں امام غزالی کی المستصفیٰ، فخر الدین رازی کی المحصول، آمدی کی الاحکام، ابن حاجب کی مختصر اور بیضاوی کی منہاج جیسی کتابوں نے اس فن کو منطقی و کلامی اسلوب عطا کیا، جبکہ حنفی روایت میں بزدوی، سرخسی، نسفی اور ابن ہمام کی تصانیف نے اسے فقہی فروع سے مربوط رکھا۔ شاطبی کی الموافقات نے مقاصد شریعت کی بحث کو اس علم کا مستقل اور مرکزی حصہ بنا دیا۔

طریقہ متکلمین (طریقہ شافعیہ) کا اسلوب و منہج

علمائے متکلمین کے طریقے سے مراد وہ اسلوب ہے جس میں اصول فقہ کو فقہی فروع سے الگ، خالص نظری و عقلی بنیادوں پر مدون کیا گیا۔ اس طریقے کے علماء، جن میں شافعی، مالکی اور حنبلی اصولیوں کے ساتھ معتزلہ اور اہل کلام کے نمایاں نام شامل ہیں، پہلے عقلی و منطقی دلائل سے اصول طے کرتے ہیں اور پھر ان اصولوں کو فقہی مسائل پر منطبق کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں تعریفوں کی تحدید، تقسیمات کی کثرت، مفروضہ اعتراضات کے جوابات اور کلامی مباحث بکثرت ملتی ہیں، اور استدلال میں عقل کو نمایاں مقام دیا جاتا ہے۔ اس منہج کی خوبی یہ ہے کہ اصول آزادانہ تحقیق سے طے پاتے ہیں اور کسی مسلک کی پابندی ان پر غالب نہیں آتی، چنانچہ غیر حنفی دنیا میں یہی اسلوب رائج ہوا۔ تاہم اس پر یہ ملاحظہ کیا جاتا ہے کہ بعض اوقات اصول محض نظری بحث بن جاتے ہیں اور ایسے اصول بھی قائم کر لیے جاتے ہیں جن کی فقہی تطبیق بہت کم ملتی ہے، نیز فقہی فروع سے دوری کی وجہ سے طالب علم کو عملی فقہ سے ربط جوڑنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

طریقہ فقہائے احناف کا اسلوب و منہج

فقہائے احناف کا طریقہ اس کے برعکس ہے۔ ان کے ہاں اصول بعد میں آئے اور فقہی فروع پہلے مدون ہو چکی تھیں، چنانچہ انہوں نے اپنے ائمہ کے اجتہادات اور فقہی فیصلوں کا مطالعہ کر کے ان سے اصول اخذ کیے؛ گویا ان کے ہاں اصول فروع سے کشید کیے گئے ہیں۔ اس طریقے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اصول بیان کرتے وقت فقہی مثالیں بکثرت پیش کی جاتی ہیں، ہر قاعدے کو کسی نہ کسی فقہی مسئلے سے شرح کیا جاتا ہے اور جہاں قاعدہ اور مسلک کے معروف مسئلے میں بظاہر تعارض نظر آئے وہاں قاعدے میں تاویل یا تخصیص کی راہ اختیار کی جاتی ہے تاکہ ائمہ کے اجتہاد کو غلط قرار دینے کے بجائے اصول کو اس کے مطابق ڈھالا جائے۔ اس منہج کی خوبی اس کا عملی اور تطبیقی ہونا ہے، کیونکہ طالب علم قاعدہ سیکھنے کے ساتھ اس کا مصرف بھی جان لیتا ہے۔ اس پر ملاحظہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں اصول کبھی کبھی مسلک کی تائید کے تابع ہو جاتے ہیں اور آزاد نظری تحقیق کا پہلو نسبتاً کم ہو جاتا ہے، تاہم حنفی علماء کا جواب یہ ہے کہ ائمہ کا اجتہاد خود نصوص پر مبنی تھا اس لیے ان کے فروع سے اصول اخذ کرنا درحقیقت نصوص ہی سے اصول اخذ کرنا ہے۔

جدول 1: طریقہ متکلمین اور طریقہ فقہائے احناف کا موازنہ

پہلو	طریقہ متکلمین (شافعیہ)	طریقہ فقہائے احناف
اصول کی ترتیب	پہلے اصول، پھر ان کی روشنی میں فروع	پہلے فروع موجود، ان سے اصول اخذ کیے گئے
استدلال کا رنگ	عقلی، منطقی اور کلامی	نقلی اور فقہی مثالوں پر مبنی، تطبیقی
مسلک سے نسبت	مسلک سے آزاد نظری تحقیق	ائمہ کے اجتہاد سے ہم آہنگی کی کوشش
مشہور کتب	الرسالہ، المستصفیٰ، المحصول، الاحکام	الفصول للجصاص، اصول بزدوی، اصول سرخسی، المنار
بڑی خوبی	اصولوں کی آزادی و گہرائی	اصول و فروع کا عملی ربط اور مثالوں کی کثرت

دونوں مناہج کا باہمی تعلق اور بعد کی تطبیق

بعد کے ادوار میں بعض علماء نے دونوں طریقوں کو جمع کرنے کی کوشش کی، تاکہ نظری گہرائی اور فقہی تطبیق دونوں فوائد حاصل ہو جائیں۔ اس جامع اسلوب کی بہترین مثال ابن ہمام کی التحریر اور اس کی مشہور شرحیں ہیں، اسی طرح تاج الدین سبکی کی جمع الجوامع نے مختلف مسالک کے اصولوں کو ایک خانقاہی نظام میں سمونے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں مناہج میں اختلاف مقصد کا نہیں، ترتیب و اسلوب کا ہے؛ دونوں کا مقصد کتاب و سنت سے درست استنباط ہے۔ متکلمین نے اصولوں کو آزاد علمی موضوع بنا کر اس فن کو وسعت دی اور احناف نے اسے زندہ فقہ سے جوڑ کر اس کی افادیت کو ثابت کیا۔ آج کے طالب علم کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ دونوں روایتوں سے استفادہ کرے: اصول سمجھنے میں نظری دقت بھی اختیار کرے اور ہر قاعدے کو فقہی مثال سے بھی پرکھے، کیونکہ مثال کے بغیر قاعدہ ذہن میں راسخ نہیں ہوتا اور قاعدے کے بغیر مثالیں محفوظ نہیں رہتیں۔ اسی توازن سے استنباط کی صحیح اہلیت پیدا ہوتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اصول فقہ قرآن و سنت سے عملی احکام کے استنباط کے قواعد کا علم ہے، اس کی غرض و غایت درست فہم، تعارض کا حل اور نئے مسائل میں رہنمائی حاصل کرنا ہے۔ اس علم کی جڑیں عہد نبوی و عہد صحابہ کے اجتہادی طرز میں ملتی ہیں، امام شافعی کی الرسالہ نے اسے باقاعدہ فن بنایا اور پھر دو عظیم اسالیب سامنے آئے: متکلمین کا نظری و عقلی طریقہ اور فقہائے احناف کا فروع سے اصول کشید کرنے کا تطبیقی طریقہ۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرے میں اس فن کی بے مثال خدمت کی اور بعد کے علماء نے انہیں یکجا کرنے کی کامیاب کوششیں بھی کیں۔ طالب علم پر لازم ہے کہ وہ اس تاریخ اور ان مناہج سے واقفیت کو محض امتحانی معلومات نہ سمجھے بلکہ اسے اپنی فقہی بصیرت کی بنیاد بنائے۔

سوال نمبر 2: دلیل شرعی، قطعی و ظنی کی تقسیم اور قرآن و سنت کا مقام (20 نمبر)

سوال نمبر 2: دلیل شرعی سے کیا مراد ہے؟ نیز قطعی الثبوت، قطعی الدلالت، ظنی الثبوت اور ظنی الدلالت کی تقسیم کی روشنی میں قرآن کریم اور سنت نبوی کے بطور بنیادی ماخذ شریعت مقام و مرتبے کا تفصیلی جائزہ لیں۔ (20)

تعارف

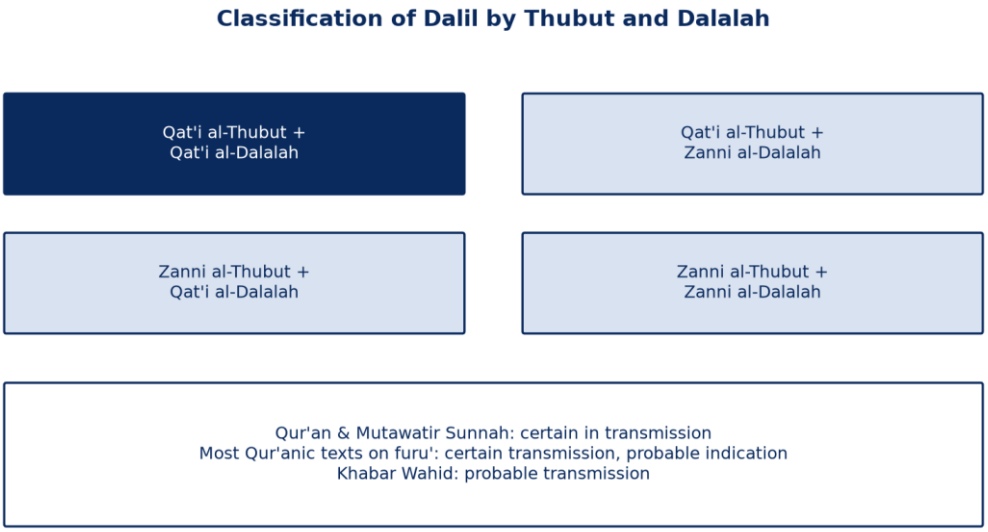
شریعت اسلامیہ کے تمام احکام دلائل پر قائم ہیں، اور دلیل شرعی ہی وہ بنیاد ہے جس کی روشنی میں کسی حکم کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ دلیل کے بغیر کوئی قول دین نہیں بن سکتا، اسی لیے اصول فقہ کی سب سے پہلی اور بنیادی بحث دلائل شرعیہ کی تعریف، ان کی اقسام اور ان کے مراتب کی ہے۔ دلائل کی قوت یکساں نہیں ہوتی؛ بعض دلائل اپنے ثبوت اور دلالت دونوں میں قطعی ہوتے ہیں اور بعض میں ظن کا پہلو پایا جاتا ہے۔ یہی تقسیم آگے چل کر اجتہاد کے دائرے، فقہی اختلاف کے جواز اور تکفیری و انکاری مسائل کی حدود کو متعین کرتی ہے۔ اس جواب میں پہلے دلیل شرعی کا مفہوم واضح کیا جائے گا، پھر قطعی و ظنی کی چار صورتوں کی تفصیل بیان ہو گی اور آخر میں اسی تقسیم کی روشنی میں قرآن کریم اور سنت نبوی کے بنیادی ماخذ ہونے اور ان کے باہمی مرتبے کا جائزہ لیا جائے گا۔

دلیل شرعی سے مراد

دلیل کے لغوی معنی رہنما اور راستہ بتانے والے کے ہیں۔ اصطلاح اصول میں دلیل شرعی سے مراد وہ چیز ہے جس پر صحیح غور و فکر سے کسی عملی شرعی حکم تک رسائی حاصل ہو۔ اس تعریف میں دلائل شرعیہ کی تمام اقسام آ جاتی ہیں، جنہیں بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: دلائل متفق علیہا اور دلائل مختلف فیہا۔ دلائل متفق علیہا چار ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع امت اور قیاس شرعی۔ ان کے علاوہ استحسان، مصالح مرسلہ، استصحاب، سد ذرائع، عرف اور شرائع من قبلنا جیسے دلائل میں فقہاء کے درمیان بحث و اختلاف پایا جاتا ہے۔ دلیل اور حجت میں معمولی فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دلیل عام ہے اور حجت وہ دلیل ہے جو خصم پر الزام کے لیے پیش کی جائے۔ اسی طرح امارہ اس دلیل کو کہتے ہیں جو ظن کا فائدہ دے جبکہ قطعی دلیل یقین پیدا کرتی ہے۔ یہ اصطلاحی باریکیاں محض لفظی نہیں ہیں، کیونکہ انہی سے معلوم ہوتا ہے کہ کس دلیل کے مقابلے میں اجتہاد یا اختلاف کی گنجائش ہے اور کہاں تسلیم و انقیاد ہی واحد راستہ ہے۔

ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے چار صورتیں

ہر نص کو دو حیثیتوں سے پرکھا جاتا ہے: ایک اس کا ثبوت یعنی اس کا شارع سے ثابت ہونا، اور دوسری اس کی دلالت یعنی اس کا کسی خاص مفہوم پر رہنمائی کرنا۔ جب نص کا ثبوت یقینی ہو تو اسے قطعی الثبوت اور جب اس میں احتمال پایا جائے تو ظنی الثبوت کہتے ہیں؛ اسی طرح جب نص کا مفہوم صرف ایک ہی نکلے تو وہ قطعی الدلالت اور جب اس میں ایک سے زیادہ مفاہیم کا احتمال ہو تو ظنی الدلالت کہلاتی ہے۔ ان دو درجہ حیثیتوں کے اجتماع سے چار صورتیں بنتی ہیں۔ پہلی صورت قطعی الثبوت و قطعی الدلالت ہے، جیسے نماز، زکاۃ اور روزے کی فرضیت پر دلالت کرنے والی واضح آیات؛ ان کا انکار دائرہ ایمان سے خارج کر دینے والا سمجھا جاتا ہے اور ان میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ دوسری صورت قطعی الثبوت و ظنی الدلالت ہے، یعنی آیت یقینی طور پر قرآن ہے مگر اس کے مفہوم میں فقہاء کے درمیان اجتہادی اختلاف ممکن ہے؛ اصول کی بیشتر عملی مباحث اسی قسم سے متعلق ہیں۔ تیسری صورت ظنی الثبوت و قطعی الدلالت ہے، جیسے بعض اخبار آحاد جن کا مفہوم واضح اور ایک ہی ہو۔ چوتھی صورت ظنی الثبوت و ظنی الدلالت ہے جس میں ثبوت اور مفہوم دونوں میں ظن کا پہلو ہو، اور یہی اجتہاد و اختلاف کا سب سے وسیع میدان ہے۔ فقہی اختلافات کی عظیم اکثریت آخری تین صورتوں میں پیدا ہوتی ہے، پہلی صورت میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔



تصویر 1: ثبوت و دلالت کے اعتبار سے دلیل کی چار صورتیں۔

جدول 1: قطعی و ظنی کی چار صورتیں اور ان کا حکم

صورت	تعریف	اثر و حکم
قطعی الثبوت، قطعی الدلالت	ثبوت بھی یقینی، مفہوم بھی ایک اور واضح	انکار جائز نہیں؛ اجتہاد کی گنجائش نہیں
قطعی الثبوت، ظنی الدلالت	ثبوت یقینی، مفہوم میں احتمالات	تسلیم واجب، مفہوم میں اجتہادی اختلاف ممکن
ظنی الثبوت، قطعی الدلالت	سند میں ظن، مفہوم واضح	عمل واجب؛ انکار سے فسق کا حکم، کفر کا نہیں
ظنی الثبوت، ظنی الدلالت	ثبوت و مفہوم دونوں میں ظن	اجتہاد و اختلاف کا وسیع میدان

قرآن کریم کا مقام: قطعی الثبوت بنیادی ماخذ

قرآن کریم شریعت کا پہلا اور سب سے بڑا ماخذ ہے۔ اس کا ثبوت قطعی ہے کیونکہ یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوتا آیا ہے؛ ہر دور میں بے شمار حافظوں اور مصاحف کے ذریعے ایک ایک حرف محفوظ رہا اور آج دنیا بھر کے نسخوں میں کوئی اختلاف نہیں۔ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے، اس لیے اس کے قطعی الثبوت ہونے میں امت کا اجماع ہے۔ البتہ دلالت کے اعتبار سے قرآن کی تمام آیات یکساں نہیں؛ آیات احکام کی ایک تعداد قطعی الدلالت ہے جن کا ایک ہی مفہوم ہے، جبکہ بہت سی آیات میں عام و خاص، مطلق و مقید، مجمل و مبین اور ناسخ و منسوخ کی بحث آتی ہے جن کی دلالت ظنی ہوتی ہے اور یہی اصولی مباحث کا اصل میدان ہے۔ قرآن شریعت کے کلی اصول اور بنیادی احکام دیتا ہے: عقائد، عبادات کے اصول، معاملات کے قواعد، اخلاق کی بنیادیں اور حدود و تعزیرات کے اہم احکام سب اسی میں ہیں۔ قرآن کی حجیت پر ایمان دین کی اساس ہے اور اس کے کسی جز کا انکار ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے، جبکہ اس کی تفسیر و تشریح میں اہل علم کا اجتہادی اختلاف رحمت و وسعت کا سبب بنتا ہے، بہ شرط یہ کہ وہ قواعد تفسیر کے اندر رہے۔

سنت نبوی کا مقام: وحی کی عملی تفسیر اور دوسرا ماخذ

سنت نبوی قرآن کے بعد شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ ہے۔ سنت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات ہیں۔ قرآن نے خود سنت کی حجیت قائم کی ہے؛ ارشاد ہے کہ رسول جو کچھ دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ، اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ نبی اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ ان کا کلام وحی ہوتا ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔ سنت کے تین بڑے وظائف ہیں: قرآن کے احکام کی تائید و تاکید، قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل و تبیین، اور بعض ایسے احکام کا اثبات جو قرآن میں صراحت کے ساتھ نہیں آئے۔ نماز کی رکعات و اوقات، زکاۃ کے نصاب اور حج کے مناسک جیسی تفصیلات سنت ہی سے معلوم ہوتی ہیں، اس لیے سنت کو نظر انداز کر کے قرآن پر عمل درحقیقت ممکن ہی نہیں۔ ثبوت کے اعتبار سے سنت کی دو بڑی قسمیں ہیں: متواتر سنت جو قطعی الثبوت ہے اور خبر واحد جو ظنی الثبوت ہے؛ البتہ جمہور علماء کے نزدیک صحیح خبر واحد پر عمل واجب ہے کیونکہ دین کا بڑا حصہ اسی ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے، البتہ اعتقادی قطعیات میں اس کا درجہ متواتر سے کم رکھا جاتا ہے۔

قرآن و سنت کا باہمی تعلق اور مرتبہ

قرآن و سنت کے مرتبے کو سمجھنے میں تین اصول بنیادی ہیں۔ پہلا یہ کہ حجیت میں دونوں وحی ہیں اور دونوں پر عمل فرض ہے، اس حیثیت سے سنت قرآن کے تابع نہیں بلکہ اس کی شارح و مبین ہے۔ دوسرا یہ کہ ثبوت کے اعتبار سے قرآن سارا قطعی ہے جبکہ سنت کا بیشتر حصہ ظنی الثبوت ہے، اس لیے تعارض کی صورت میں اصولی ترتیب میں قرآن کو ظاہری تقدم حاصل ہوتا ہے اور سنت کو قرآن کے موافق سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تیسرا یہ کہ سنت قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے یا نہیں، اس میں علماء کے درمیان مشہور اختلاف ہے: امام شافعی کے نزدیک قرآن کا نسخ قرآن ہی سے ہوتا ہے جبکہ احناف کے ہاں مشہور و متواتر سنت سے بھی نسخ ممکن ہے؛ یہ اختلاف بھی درحقیقت قطعی و ظنی کی اسی تقسیم کے اطلاق کا نتیجہ ہے۔ عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طالب علم قرآن کو اصل اور سنت کو اس کی عملی صورت سمجھ کر دونوں کو ایک وحدت کی طرح پڑھے، کیونکہ نبی کریم کی زندگی قرآن ہی کی چلتی پھرتی تفسیر تھی، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔

اس تقسیم کے عملی فوائد واثرات

قطعی وظنی کی تقسیم محض نظری ورزش نہیں بلکہ اس کے گہرے عملی اثرات ہیں۔اسی تقسیم سے معلوم ہوتا ہے کہ کن امور میں اختلاف کرنے والے کو غلط کہا جاسکتا ہے مگر اس پر سخت احکام نہیں لگائے جاسکتے؛فقہاء کا اصول ہے کہ اجتہادی مسائل میں انکار نہیں کیا جاتا۔اسی تقسیم سے فتویٰ کی ذمہ داری کا اندازہ ہوتا ہے کہ قطعی امور میں مفتی کے پاس نرمی کی گنجائش نہیں جبکہ ظنی امور میں وسعت پائی جاتی ہے۔حدیث دور میں اس تقسیم کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، کیونکہ بعض لوگ ظنی مسائل کو قطعی بنا کر شدت پیدا کرتے ہیں اور بعض قطعی احکام کو ظنی کہہ کر ان کی اہمیت گھٹاتے ہیں؛اصول فقہ کا صحیح فہم ان دونوں انتہاؤں سے بچاتا ہے۔یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ قطعیات دینیہ کے انکار واثبات جیسے حساس امور پر کسی فرد کے بارے میں فیصلہ اہل علم اور بااختیار اداروں کا کام ہے؛طالب علم کا کام دلائل کے مراتب سمجھنا اور علمی ادب اختیار کرنا ہے،اشخاص پر احکام لگانا نہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ دلیل شرعی وہ ذریعہ ہے جس سے حکم شرعی تک رسائی ہوتی ہے،اور ثبوت ودلالت کے اعتبار سے اس کی چار صورتیں بنتی ہیں جن سے ہر دلیل کا درجہ متعین ہو جاتا ہے۔قرآن کریم قطعی الثبوت ہونے کی وجہ سے شریعت کا سب سے بلند اور پہلا ماخذ ہے،جبکہ سنت نبوی اس کی تبیین وتفصیل کرنے والا دوسرا بنیادی ماخذ ہے جس کا متواتر حصہ قطعی اور اخبار آحاد ظنی الثبوت ہیں مگر عمل میں حجت ہیں۔اس درجہ بندی نے امت کو ایک طرف قطعیات میں وحدت عطا کی اور دوسری طرف ظنیات میں اجتہادی وسعت دے کر شریعت کو ہر دور کے مسائل سے ہم آہنگ رکھنے کی صلاحیت بخشی۔

سوال نمبر3: اجماع کی تعریف،اقسام اور حجیت اجماع(20نمبر)

سوال نمبر3: اجماع کی لغوی واصطلاحی تعریف بیان کریں،اس کی اقسام(صریح اور سکوتی) کی وضاحت کریں اور حجیت اجماع کے شرعی وعقلی دلائل تفصیل سے رقم کریں۔

(20)

تعارف

اجماع اصول فقہ کے متفق علیہ دلائل میں تیسرا بڑا دلیل ہے اور قرآن و سنت کے بعد شریعت کی وحدت و حفاظت کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔ اجماع نے امت کو انتشار سے بچایا، بنیادی احکام کو نسل در نسل قطعی صورت میں منتقل کیا اور اجتہاد کو اجتماعی بنیاد فراہم کی۔ جمع قرآن، نماز تراویح کا اجتماعی اہتمام اور بے شمار فقہی مسائل کے فیصلے اجماع ہی کی عملی صورت ہیں۔ اس جواب میں پہلے اجماع کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے ارکان بیان کیے جائیں گے، پھر اس کی مشہور اقسام صریح اور سکوتی کی وضاحت کی جائے گی، اور آخر میں قرآن و سنت سے اس کے شرعی دلائل اور عقلی دلائل تفصیل سے پیش کیے جائیں گے تاکہ معلوم ہو کہ اہل علم کی اکثریت اجماع کو قطعی حجت کیوں قرار دیتی ہے اور اس کے انکار کی علمی حیثیت کیا ہے۔

اجماع کی لغوی تعریف

اجماع کے لغوی معنی دو ہیں: ایک پختہ ارادہ اور عزم کرنا، جیسا کہ عرب کہتے ہیں کہ فلاں نے اس کام کا اجماع کر لیا یعنی اس نے اس کو پختہ ارادہ کر لیا، اور دوسرا کسی بات پر اتفاق کر لینا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ عزم کے معنی میں آیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا کہ اپنے معاملے کا اجماع کر لو یعنی پختہ فیصلہ کر لو۔ علماء نے اس لغوی مناسبت کو یوں سمجھایا کہ اجماع میں محض اتفاق ہی نہیں بلکہ پختگی اور قطعیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ چند افراد کی اتفاقی رائے کو اجماع نہیں کہا جاتا بلکہ اس کے لیے پوری امت کے اہل حل و عقد یعنی مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر متفق ہونا ضروری ہے۔ لغوی معنی کی یہ گہرائی اصطلاحی تعریف میں بھی جھلکتی ہے، جہاں اجماع کو اتفاق کے ساتھ ساتھ ایک فیصلہ کن اور حتمی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

اجماع کی اصطلاحی تعریف اور اس کے ارکان

اصطلاح اصول میں اجماع کی مشہور تعریف یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی زمانے میں امت محمدیہ کے تمام مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر اتفاق کر لینا اجماع کہلاتا ہے۔ اس تعریف سے اجماع کے چار ارکان نکلتے ہیں۔ پہلا رکن اتفاق کرنے والے ہیں جو مجتہدین ہوں، عوام یا غیر مجتہد علماء کی رائے اس میں شمار نہیں ہوتی کیونکہ

اجماع علمی اجتہاد کا اجتماعی فیصلہ ہے۔ دوسرا رکن یہ ہے کہ اتفاق تمام مجتہدین کا ہو، اگر اس زمانے کے ایک بھی مجتہد کی مخالفت معلوم ہو تو اجماع منعقد نہیں ہوتا۔ تیسرا رکن موضوع ہے یعنی وہ حکم شرعی عملی ہو جس پر اتفاق ہوا ہو، عقلی یا عادی امور اجماع کا موضوع نہیں بنتے۔ چوتھا رکن زمانہ ہے، یعنی یہ اتفاق حضور اکرم کی وفات کے بعد کے کسی دور میں ہو، کیونکہ آپ کی حیات میں اصل حجت خود آپ کی ذات تھی۔ بعض علماء نے اجماع کے لیے سند یعنی کسی شرعی دلیل کی موجودگی کو بھی شرط قرار دیا ہے، کیونکہ مجتہدین کا اتفاق ہوا میں نہیں ہوتا بلکہ کتاب، سنت، قیاس یا مصلحت جیسی کسی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، البتہ ایک بار اجماع منعقد ہو جائے تو پھر اس کی حجیت خود مستقل ہو جاتی ہے۔

اجماع صریح

اجماع صریح اس اتفاق کو کہتے ہیں جس میں تمام مجتہدین اپنی رائے صراحت کے ساتھ بیان کریں، خواہ قول کے ذریعے ہو یا فعل کے ذریعے۔ جب ہر مجتہد نے اپنی موافقت کا واضح اظہار کر دیا ہو تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اسی لیے اجماع صریح کو علماء کی اکثریت قطعی حجت قرار دیتی ہے اور اس کی مخالفت کو جائز نہیں سمجھتی۔ اجماع صریح کی روشن مثال خلافت کے قیام پر صحابہ کا اتفاق، قرآن مجید کا ایک مصحف پر جمع کیا جانا اور نماز و زکاۃ کی بنیادی تفصیلات پر امت کا متواتر اتفاق ہے۔ اس قسم کے اجماع کا ثبوت بھی نسبتاً آسان ہوتا ہے کیونکہ ہر مجتہد کا قول محفوظ ہوتا ہے، البتہ بعد کے ادوار میں تمام مجتہدین کے اقوال کو جمع کرنا ایک مشکل کام رہا ہے، اسی لیے علماء نے اجماع کے دعووں کی جانچ پر بہت زور دیا ہے اور ہر دعویٰ اجماع کو قبول کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کو ضروری قرار دیا ہے۔ ابن حزم کی مراتب الاجماع اور ابن قدامہ و دیگر اصولیوں کی تصانیف اسی تحقیق کی کوششیں ہیں۔

اجماع سکوتی

اجماع سکوتی اس صورت کو کہتے ہیں کہ کسی زمانے کے بعض مجتہدین کوئی رائے ظاہر کریں اور باقی مجتہدین تک وہ رائے پہنچ جائے، مناسب مدت گزر جائے مگر وہ نہ اس کی تائید کریں نہ مخالفت، بلکہ سکوت اختیار کریں۔ چونکہ غور و فکر کی مہلت کے بعد سکوت کو رضامندی کی علامت سمجھا گیا، اس لیے اسے سکوتی اجماع کہا گیا۔ اس کی حجیت میں علماء کا اختلاف ہے: احناف اور بعض دیگر علماء کے نزدیک یہ حجت ہے مگر اس کا درجہ اجماع صریح سے کم ہے اور اسے ظنی دلیل شمار کیا جاتا ہے، جبکہ امام شافعی اور بعض دیگر اصولی

حضرات اسے حقیقی اجماع ہی نہیں مانتے، کیونکہ سکوت کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں، مثلاً معاملہ ابھی زیر غور ہو، مخالفت سے فتنے کا اندیشہ ہو یا رائے کا علم ہی مکمل طور پر نہ پہنچا ہو۔ اس اختلاف سے طالب علم کے لیے یہ سبق ملتا ہے کہ سکوت کو ہمیشہ رضا پر محمول کرنا درست نہیں، البتہ جب تمام قرائن رضا کی طرف اشارہ کریں تو اس کی علمی قدر و قیمت سے انکار بھی مشکل ہے۔ عملی طور پر فقہی کتب میں اجماع سکوتی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور ان کی بنیاد پر کئی مسائل کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

جدول 1: اجماع صریح اور اجماع سکوتی کا موازنہ

پہلو	اجماع صریح	اجماع سکوتی
اظہار رائے	تمام مجتہدین صراحت سے اتفاق بیان کریں	بعض بیان کریں، باقی سکوت اختیار کریں
حجیت	جمہور کے نزدیک قطعی حجت	اختلافی؛ احناف کے نزدیک ظنی حجت
یقین کا درجہ	شک کی گنجائش نہیں	سکوت کی تاویل ممکن ہونے سے ظن پیدا ہوتا ہے
ثبوت	اقوال محفوظ ہونے سے نسبتاً آسان	سکوت کی اطلاع و مدت کی تحقیق لازم

حجیت اجماع کے شرعی دلائل: قرآن سے

اجماع کی حجیت پر قرآن مجید کی کئی آیات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہے کہ جو شخص ہدایت واضح ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا دوسرا راستہ اختیار کرے، اسے اسی طرف پھیر دیا جائے گا جس طرف وہ پھرا ہے؛ اس آیت میں سبیل المومنین یعنی مومنوں کے اجتماعی راستے کی اتباع کو لازم قرار دیا گیا ہے اور یہی اجماع کی بنیادی دلیل ہے۔ سورۃ آل عمران میں امت کو بہترین امت قرار دیتے ہوئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اس کی صفت بتایا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امت کا اجتماعی موقف حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے کہ اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامو اور تفرقہ نہ ڈالو، یہ اجتماعی وحدت کا حکم بھی اجماع کے تصور کی تائید کرتا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں مومنوں کی صفت یہ بیان ہوئی کہ ان کا معاملہ آپس کے مشورے سے طے ہوتا ہے؛ اجتماعی مشاورت کا یہ اصول

اجماع کی روح ہے۔ مفسرین و اصولیوں نے ان آیات کو مجموعی طور پر پڑھ کر اجماع کی حجیت کو قرآن سے ثابت کیا ہے، اگرچہ ہر آیت بذات خود اجماع کا لفظ استعمال نہیں کرتی۔

حجیت اجماع کے شرعی دلائل: سنت سے

سنت نبوی میں اجماع کی حجیت پر سب سے مشہور دلیل یہ حدیث ہے کہ میری امت کسی گمراہی پر جمع نہیں ہو گی، اور ایک روایت میں فرمایا گیا کہ اللہ نے میری امت کو اس بات سے محفوظ رکھا ہے کہ وہ سب کے سب گمراہی پر اکٹھے ہو جائیں۔ اسی مفہوم کی دیگر احادیث میں جماعت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا گیا کہ جو جماعت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا۔ نبی کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پوری امت کا کسی باطل پر متفق ہونا ممکن نہیں۔ علمائے حدیث نے ان روایات کو اگرچہ انفرادی طور پر مختلف درجات میں رکھا ہے، مگر ان کے مجموعے سے وہ مفہوم یقینی طور پر حاصل ہوتا ہے جسے اصولی اصطلاح میں تواتر معنوی کہا جاتا ہے۔ عملی سیرت میں بھی نبی کریم صحابہ سے مشورہ فرماتے اور اجتماعی فیصلوں کو اہمیت دیتے، جس سے اجتماعی رائے کی دینی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے۔

حجیت اجماع کے عقلی دلائل

عقلی اعتبار سے بھی اجماع کی حجیت مضبوط دلائل رکھتی ہے۔ پہلی دلیل عصمت امت کا اصول ہے: یہ امت آخری امت ہے، اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اگر یہ پوری کی پوری کسی غلطی پر متفق ہو سکتی تو شریعت کی حفاظت کا وعدہ پورا نہ ہوتا؛ اس لیے اللہ نے اس امت کی اجتماعی حیثیت کو خطا سے محفوظ رکھا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اجماع درحقیقت کسی نہ کسی شرعی سند پر قائم ہوتا ہے، اور جب تمام مجتہدین مستقل تحقیق کے بعد ایک ہی نتیجے پر پہنچیں تو ان کے اتفاق کا قوی ترین قرینہ یہی ہے کہ دلیل واقعی مضبوط ہے۔ تیسری دلیل امت کی عملی ضرورت ہے: اگر اجتماعی فیصلوں کو حجت نہ مانا جائے تو بنیادی احکام بھی ہمیشہ متنازع رہیں گے اور دین کا عملی نظام قائم نہیں رہ سکے گا۔

چوتھی دلیل تاریخی تسلسل ہے: نماز، روزہ، حج اور اذان جیسی عبادات کی عملی صورتیں اجماع و تواتر ہی سے محفوظ ہم تک پہنچی ہیں، ان کا انکار عملی دین کے انکار کے مترادف ہو جائے گا۔ البتہ عقلی دلیل میں احتیاط یہ ہے کہ یہ دلائل شرعی دلائل کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں، اصل بنیاد قرآن و سنت ہی کو مانا جاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اجماع کسی زمانے کے تمام مجتہدین کا کسی شرعی حکم پر اتفاق ہے، اس کی صریح صورت قطعی حجت ہے جبکہ سکوتی صورت میں درجہ حجیت پر معتبر علمی اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن کی آیات، امت کے گمراہی پر جمع نہ ہونے کی احادیث اور عصمت امت جیسے شریعت کے عقلی دلائل مل کر اجماع کی حجیت کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اجماع نے دین کی وحدت کو محفوظ رکھا اور اجتہاد کو انفرادیت سے نکال کر اجتماعی امانت بنا دیا۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ اجماع کے دعووں میں تحقیق کا رویہ اختیار کرے، کیونکہ اجماع کی عظمت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا نام لے کر کوئی بات بغیر ثبوت کے پیش نہ کی جائے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 4: قیاس کی تعریف، ارکان، شرائط علت اور اصول صحت (20 نمبر)

سوال نمبر 4: قیاس کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس کے ارکان (اصل، فرع، علت، حکم) بیان کریں۔ نیز علت کی شرائط اور قیاس کی صحت کے بنیادی اصول و ضوابط پر مفصل بحث کریں۔ (20)

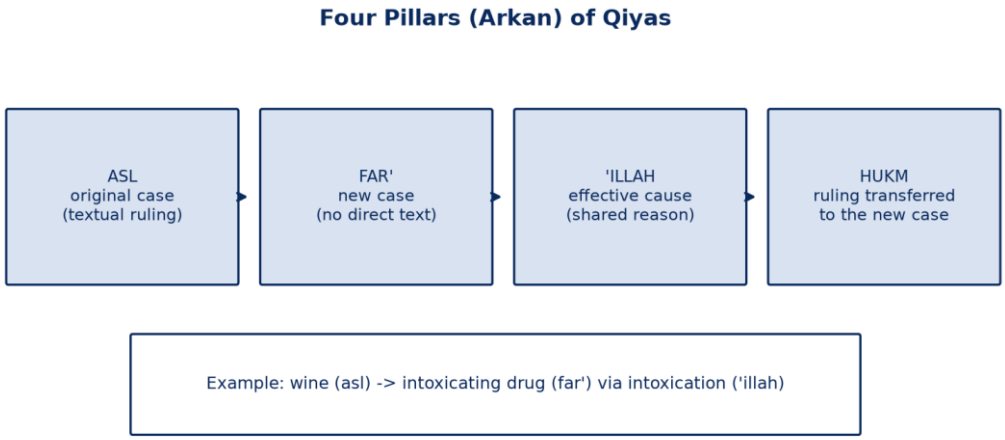
تعارف

قیاس اصول فقہ کا چوتھا متفق علیہ دلیل ہے اور شریعت کی وسعت و ہمہ گیری کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ نصوص کی تعداد محدود ہے مگر انسانی زندگی کے مسائل ہر دور میں نئے نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں؛ قیاس وہ پل ہے جو منصوص احکام کو غیر منصوص مسائل سے جوڑتا ہے۔ فقہ کی تاریخ میں قیاس ہی کے ذریعے نئے معاشی، طبی، سماجی اور قانونی مسائل کا حل پیش کیا گیا اور آج بھی جدید مسائل میں فقہاء کا اصل ذریعہ یہی ہے۔ اس جواب میں پہلے قیاس کی لغوی و اصطلاحی تعریف بیان ہو گی، پھر اس کے چار ارکان اصل، فرع،

علت اور حکم کی تفصیل آئے گی، اس کے بعد علت کی شرائط اور قیاس کی صحت کے بنیادی اصول و ضوابط پر مفصل بحث کی جائے گی تاکہ طالب علم درست قیاس اور غلط قیاس میں فرق کر سکے۔

قیاس کی لغوی و اصطلاحی تعریف

قیاس کے لغوی معنی ناپنے، اندازہ لگانے اور ایک چیز کو دوسری چیز کے برابر ٹھہرانے کے ہیں، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز کو دوسری چیز پر قیاس کیا یعنی اسے اس کے مثل قرار دیا۔ اصطلاح میں قیاس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کسی فرع یعنی نئے مسئلے کو کسی اصل یعنی منصوص مسئلے کے ساتھ اس کی علت میں اشتراک کی وجہ سے اس کے حکم میں برابر کر دینا قیاس ہے۔ سادہ الفاظ میں جب کسی نئے مسئلے کے بارے میں قرآن و سنت میں صریح حکم نہ ملے مگر اس میں وہی سبب اور وجہ پائی جائے جو کسی منصوص مسئلے کے حکم کی بنیاد ہے، تو منصوص مسئلے کا حکم اس نئے مسئلے پر بھی جاری کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً شراب کی حرمت قرآن سے ثابت ہے اور اس کی علت نشہ آوری ہے؛ پس ہر نشہ آور چیز میں یہی علت پائی جانے کی وجہ سے حرمت کا حکم اس پر بھی قیاساً جاری ہو گا۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس نیا حکم ایجاد نہیں کرتا بلکہ شارع کے حکم کو اس کی علت کی بنیاد پر وسعت دیتا ہے، یہی نکتہ قیاس کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کی بنیاد ہے۔



تصویر 1: قیاس کے چار ارکان اور ان کا باہمی تعلق۔

رکن اول ودوم: اصل اور فرع

قیاس کا پہلا رکن اصل ہے، جس سے مراد وہ مسئلہ ہے جس کا حکم کتاب یا سنت یا اجماع سے ثابت ہو اور اسی کے حکم کو آگے بڑھایا جائے۔ اصل کے لیے ضروری ہے کہ اس کا حکم شرعی ہو، عقلی یا عادی حکم قیاس کی بنیاد نہیں بنتا، اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حکم کسی خاص شخص یا خاص واقعے کے ساتھ مخصوص نہ ہو، ورنہ اسے آگے بڑھانا درست نہیں ہو گا۔ دوسرا رکن فرع ہے، جس سے مراد وہ نیا مسئلہ ہے جس کا حکم معلوم کرنا مقصود ہو اور جس کے بارے میں کوئی صریح نص موجود نہ ہو۔ فرع کے لیے شرط ہے کہ اس میں اصل کی علت مکمل طور پر پائی جائے؛ اگر علت ناقص ہو یا فرع کے بارے میں خود کوئی نص موجود ہو تو قیاس کا عمل ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ نص کی موجودگی میں قیاس کی طرف رجوع اصول کے خلاف ہے۔ اصل و فرع کے تعین میں غلطی پورے قیاس کو باطل کر دیتی ہے، اسی لیے مجتہد سب سے پہلے یہی جانچ کرتا ہے کہ معاملہ واقعی غیر منصوص ہے اور مجوزہ اصل کے ساتھ اس کا تعلق حقیقی ہے یا محض ظاہری مشابہت ہے۔

رکن سوم وچہارم: علت اور حکم

تیسرا اور سب سے اہم رکن علت ہے۔ علت سے مراد وہ ظاہر اور منضبط وصف ہے جس کی بنیاد پر شارع نے اصل کا حکم مقرر کیا ہو اور جس کے پائے جانے سے حکم پایا جائے اور نہ پائے جانے سے حکم نہ پایا جائے۔ علت کی شناخت کو اصول میں تنقیح المناط اور تحقیق المناط جیسی بحثوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور علت معلوم کرنے کے راستوں کو مسالک العلت کہا جاتا ہے، جن میں نص کی صراحت، اجماع اور اجتہادی استنباط شامل ہیں۔ چوتھا رکن حکم ہے، یعنی وہ شرعی حکم جو اصل کے لیے ثابت ہے اور فرع کی طرف منتقل کیا جاتا ہے، جیسے وجوب، حرمت، جواز یا فساد۔ حکم کے لیے شرط ہے کہ وہ ایسا ہو جو علت کے ساتھ منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو؛ عبادات کی مخصوص صورتیں اور مقررہ مقداریں جو حکمت تو سمجھ میں آ سکتی ہیں مگر ان کی علت قطعی طور پر متعین نہیں ہوتیں، ان میں قیاس احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ علت اور حکم کا یہ باہمی تعلق ہی قیاس کی جان ہے، کیونکہ حکم علت کے ساتھ گھومتا ہے، جہاں علت ہو گی وہاں حکم ہو گا اور جہاں علت نہیں ہو گی وہاں حکم بھی نہیں ہو گا۔

جدول 1: قیاس کے ارکان شراب و نشہ آور اشیاء کی مثال سے

رکن	اس مثال میں صورت	وضاحت
اصل	شراب (خمر)	حرمت قرآن سے ثابت ہے
فرع	جدید نشہ آور اشیاء	ان پر صریح نص موجود نہیں
علت	نشہ آوری (اسکار)	دونوں میں مشترک ظاہر منضبط وصف
حکم	حرمت	علت کے اشتراک سے فرع کی طرف منتقل ہوا

علت کی شرائط

علت کے درست ہونے کے لیے اصولیوں نے کئی شرائط بیان کی ہیں، جن میں سے اہم یہ ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ علت ظاہر ہو، یعنی حسی یا واضح قرائن سے معلوم ہو سکے؛ خفی اور مشکوک اوصاف کو علت بنانے سے احکام غیر یقینی ہو جائیں گے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ علت منضبط ہو، یعنی اس کی مقدار اور حدود متعین ہوں اور وہ افراد کے اختلاف سے بدلتی نہ ہو؛ اسی لیے نشہ آوری کو علت بنایا گیا مگر لذت یا ذائقے کو نہیں، کیونکہ وہ منضبط نہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ علت مناسب ہو، یعنی اس وصف اور حکم کے درمیان وہ مناسبت پائی جائے جو مقاصد شریعت سے ہم آہنگ ہو، جیسے عقل کی حفاظت کے مقصد کے لیے نشے کو حرمت کی علت بنانا مناسب ہے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ علت متعدی ہو، یعنی اصل سے آگے بڑھ کر فرع میں بھی پائی جائے؛ جو وصف اصل ہی میں مقصور ہو وہ قیاس کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ علت کسی نص یا اجماع کے معارض نہ ہو، کیونکہ نص کے مقابلے میں اپنی اختراع کردہ علت پیش کرنا قیاس نہیں بلکہ نص سے انحراف ہے۔ چھٹی شرط یہ ہے کہ علت قاصر نہ ہو اور حکم کے ساتھ اس کا دوران ثابت ہو، یعنی جہاں علت پائی جائے وہاں حکم بھی ملے اور جہاں علت نہ ہو وہاں حکم بھی عام طور پر نہ پایا جائے۔

قیاس کی صحت کے بنیادی اصول وضوابط

علت کی شرائط کے علاوہ قیاس کی صحت کے لیے چند عمومی ضوابط مقرر ہیں۔ پہلا ضابطہ یہ ہے کہ قیاس نص کے مقابلے میں نہیں کیا جائے گا؛ جہاں صریح حکم موجود ہے وہاں قیاس ختم ہو جاتا ہے، اور جو قیاس نص کے خلاف نتیجہ دے وہ فاسد الاعتبار کہلاتا ہے۔ دوسرا ضابطہ یہ ہے کہ قیاس کسی ایسی چیز پر نہ ہو جو خود عام قاعدے سے مستثنیٰ ہو، کیونکہ استثناء کو بنیاد بنا کر قیاس کرنا قیاس علی الشاذ کے دائرے میں آتا ہے۔ تیسرا ضابطہ یہ ہے کہ اصل کا حکم معقول المعنی ہو، یعنی اس کی علت عقل سے معلوم ہو سکتی ہو؛ جو احکام محض تعبدی ہیں اور ان کی علت سمجھ میں نہیں آتیں، ان میں قیاس کا دائرہ تنگ رکھا گیا ہے۔ چوتھا ضابطہ یہ ہے کہ قیاس سے کوئی ایسا نتیجہ نہ نکلے جو شارع کے معلوم مقاصد سے ٹکرائے، مثلاً کسی جائز سہولت کو قیاس کے ذریعے اس طرح بڑھانا کہ اصل ممانعت ہی ختم ہو جائے۔ پانچواں ضابطہ درجہ بندی کا ہے: قیاس جلی جس میں علت قطعی طور پر معلوم ہو قیاس خفی سے مقدم ہے، اور تعارض کی صورت میں انہی مراتب کو دیکھ کر ترجیح دی جاتی ہے۔ ان ضوابط نے قیاس کو من مانی رائے سے بچا کر ایک منظم علمی عمل بنا دیا ہے۔

قیاس کی حجیت اور اس پر اعتراضات کا مختصر جائزہ

جمہور علماء قیاس کو شرعی حجت مانتے ہیں اور اس کے دلائل قرآن و سنت و عمل صحابہ سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اعتبار حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس سے اصولیوں نے واقعات سے عبرت لے کر احکام کی توسیع کا اشارہ لیا ہے، اور سنت میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا اجتہاد بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ صحابہ نے بے شمار مسائل قیاس سے حل کیے، جیسے شرابی کی حد کو قذف کی حد پر قیاس کرنا مشہور مثال ہے۔ ظاہریہ نے قیاس کا انکار کیا اور ان کا کہنا تھا کہ نصوص تمام مسائل کے لیے کافی ہیں، مگر جمہور کا جواب یہ ہے کہ نصوص کے کلی اصول اور علتیں خود شارع نے اس لیے بیان کیں تاکہ ان سے آگے بڑھا جا سکے، اور قیاس کا انکار عملاً امت کو نئے مسائل میں بے راہ کر دیتا ہے۔ یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ قیاس کا میدان ظنی احکام ہے؛ اس سے پیدا ہونے والے اختلاف کو برداشت کرنا اور دوسرے مجتہد کی رائے کا احترام کرنا علمی ادب ہے، کیونکہ قیاسی حکم اپنے درجے میں ظنی ہوتا ہے اور اسے قطعی کا درجہ دینا بھی اصول کے خلاف ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قیاس علت کے اشتراک کی بنیاد پر اصل کے حکم کو فرع کی طرف منتقل کرنے کا نام ہے، اس کے چار ارکان اصل، فرع، علت اور حکم ہیں جن میں علت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ علت کے ظاہر، منضبط، مناسب اور متعدی ہونے جیسی شرائط اور نص کے مقابلے میں قیاس نہ کرنے جیسے ضوابط نے اسے ایک محفوظ اور منظم ذریعہ استنباط بنا دیا ہے۔ قیاس ہی کی بدولت شریعت ہر دور کے نئے مسائل کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، بشرطیکہ اسے اس کے اصولوں کے اندر رہ کر استعمال کیا جائے اور اس کے ظنی ہونے کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے نتائج میں وسعت و تحمل کا رویہ اختیار کیا جائے۔

سوال نمبر5: استحسان، مصالح مرسلہ اور مقاصد شریعت (20نمبر)

سوال نمبر5: استحسان اور مصالح مرسلہ (استصلاح) کا معنی و مفہوم، اقسام اور ان کی شرعی حجیت واضح کریں۔ نیز مقاصد شریعت (ضروریات، حاجیات، تحسینیات) کو مدنظر رکھتے ہوئے مصالح مرسلہ پر عمل کی شرائط پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ (20)

تعارف

قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کے بعد اصول فقہ میں چند ایسے دلائل بھی زیر بحث آتے ہیں جنہیں مختلف بالدلائل کہا جاتا ہے، ان میں استحسان اور مصالح مرسلہ سب سے مشہور ہیں۔ ان دلائل کی اہمیت اس لیے ہے کہ زندگی کے مسائل صرف ظاہری قیاس سے حل نہیں ہوتے؛ بعض اوقات قیاس کے ظاہر نتیجے پر عمل سے مشقت یا مقصد شریعت کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، اور بعض نئے مسائل میں نص یا اصل موجود ہی نہیں ہوتی مگر ایک واضح مصلحت سامنے ہوتی ہے۔ ایسی صورتوں میں استحسان اور مصالح مرسلہ شریعت کے اندر رہتے ہوئے راہ نکالتے ہیں۔ اس جواب میں پہلے استحسان کا مفہوم، اقسام اور حجیت بیان ہو گی، پھر مصالح مرسلہ کا تعارف اور اس کی حجیت پر بحث آئے گی، اس کے بعد مقاصد شریعت کے تین درجات ضروریات، حاجیات اور تحسینیات کی وضاحت ہو گی اور آخر میں ان مقاصد کی روشنی میں مصالح مرسلہ پر عمل کی شرائط تفصیل سے لکھی جائیں گی۔

استحسان کا معنی و مفہوم

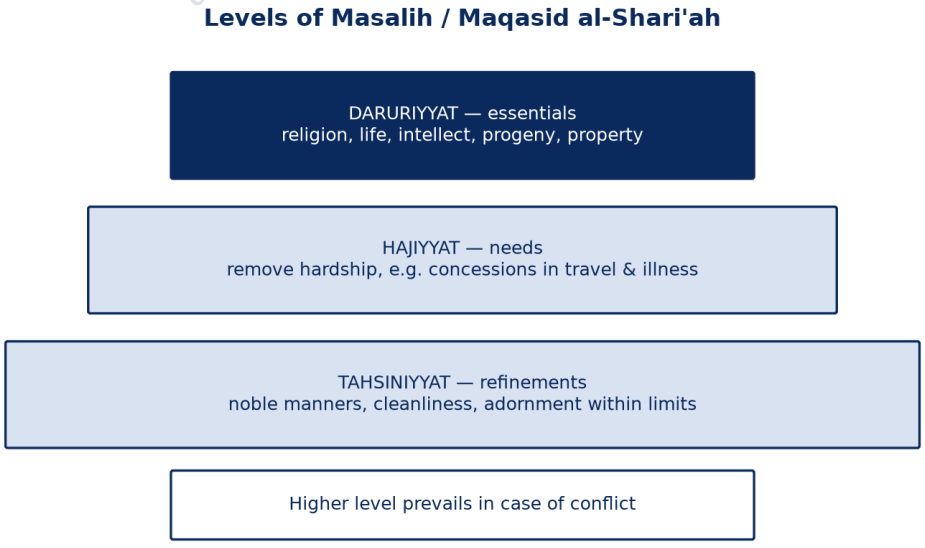
استحسان کے لغوی معنی کسی چیز کو اچھا اور پسندیدہ سمجھنا ہے۔ اصطلاح میں استحسان کی مشہور تعریف یہ ہے کہ مجتہد کسی مسئلے میں ظاہری قیاس کو چھوڑ کر اس سے قوی تر دلیل کی بنا پر اس کے خلاف حکم اختیار کرے۔ اس تعریف کی روشنی میں استحسان قیاس کی نفی نہیں بلکہ ایک قیاس کو دوسرے قوی قیاس، نص، اجماع، ضرورت یا عرف کی وجہ سے ترجیح دینا ہے۔ مثلاً عام قیاس کا تقاضا تھا کہ کرائے پر لی گئی چیز کی اجرت پہلے سے متعین معاہدے کے بغیر جائز نہ ہو، مگر لوگوں کے عرف و تعامل اور ضرورت کی بنیاد پر حمام اور سواری وغیرہ کے کرایے کو جائز قرار دیا گیا۔ ایک اور مشہور مثال یہ ہے کہ شکاری پرندے کے جھوٹے پانی کے بارے میں ظاہری قیاس سے نجاست کا حکم بنتا تھا مگر ضرورت اور عمومی ابتلاء کی وجہ سے اس میں نرمی اختیار کی گئی۔ احناف کے ہاں استحسان کا وسیع استعمال ملتا ہے، امام مالک کے ہاں بھی اسے خاص اہمیت حاصل ہے، جبکہ امام شافعی نے اس کی سخت مخالفت کی اور فرمایا کہ جو استحسان کرتا ہے وہ خود شارع بنتا ہے؛ اس اعتراض کا جواب احناف نے یہ دیا کہ ان کا استحسان ذاتی پسند نہیں بلکہ دلیل کی بنیاد پر عدول ہے، اس لیے اصل اختلاف بڑی حد تک اصطلاح اور تطبیق کا ہے، مفہوم کا اتنا نہیں۔

استحسان کی اقسام

استحسان کی اقسام اس بنیاد پر بیان کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے قیاس کو چھوڑا جاتا ہے۔ پہلی قسم استحسان بالنص ہے، جہاں نص کی موجودگی قیاس کو ختم کر دیتی ہے، مثلاً بیع سلم کو عام قیاس کے خلاف نص کی بنیاد پر جائز قرار دیا گیا۔ دوسری قسم استحسان بالاجماع یعنی اجماع کی بنیاد پر ہے، جیسے استصناع یعنی آرڈر پر چیز بنوانے کا معاہدہ امت کے تعامل و اجماع عملی سے جائز ہوا۔ تیسری قسم استحسان بالضرورت ہے، جہاں ضرورت یا حاجت عامہ کی وجہ سے قیاس سے ہٹا گیا، جیسے کنویں کی تطہیر کے مقررہ احکام میں نرمی۔ چوتھی قسم استحسان بالعرف ہے، جہاں رائج عرف و رواج کو قیاس پر مقدم رکھا گیا۔ پانچویں قسم استحسان بالقیاس الخفی ہے، جہاں دو قیاسوں میں سے چھپے مگر قوی قیاس کو ظاہر کمزور قیاس پر ترجیح دی گئی؛ یہی قسم سب سے زیادہ زیر بحث رہی ہے اور اسی کی شرائط سب سے زیادہ محتاط رکھی گئی ہیں۔ ان اقسام سے واضح ہوتا ہے کہ استحسان کی ہر صورت میں قیاس کو ترک کرنے کی کوئی معقول شرعی وجہ موجود ہوتی ہے، محض طبیعت کی پسند اس کے لیے کافی نہیں ہوتی۔

مصالح مرسلہ (استصلاح) کا معنی و مفہوم اور اقسام

مصالح مرسلہ سے مراد وہ مصلحتیں ہیں جن کے اعتبار یا عدم اعتبار کے بارے میں شریعت کی کوئی خاص نص موجود نہ ہو، مگر وہ شریعت کے عمومی مقاصد سے ہم آہنگ ہوں۔ استصلاح اسی اصول پر عمل کرنے کو کہتے ہیں، یعنی ایسی مصلحت کی بنیاد پر حکم اخذ کرنا جسے شارع نے نہ صراحت کے ساتھ معتبر کہا ہو اور نہ ہی رد کیا ہو۔ اس کی مثالوں میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں قرآن مجید کا ایک مصحف میں جمع کیا جانا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں دیوان یعنی دفاتر و رجسٹروں کا قیام اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لوگوں کو ایک قراءت پر جمع کرنا شامل ہیں؛ یہ سب ایسی مصلحتیں تھیں جن کا صریح نصی حکم موجود نہ تھا مگر دین کی حفاظت کا عظیم مقصد ان سے وابستہ تھا۔ مصلحت کی درجہ بندی کے اعتبار سے اسے تین قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے: مصلحت معتبرہ جسے شارع نے نص سے معتبر ٹھہرایا ہو، مصلحت ملغاہ جسے شارع نے رد کر دیا ہو، اور مصلحت مرسلہ جو ان دونوں کے درمیان ہو۔ یاد رہے کہ مصلحت مرسلہ پر عمل کی بحث صرف انہی امور میں ہوتی ہے جہاں نص موجود نہ ہو؛ جہاں نص موجود ہے وہاں مصلحت کے نام پر اس سے انحراف مصالح مرسلہ نہیں بلکہ نص کی مخالفت ہے۔



تصویر 1: مقاصد شریعت کے تین درجات: ضروریات، حاجیات اور تحسینیات۔

استحسان و مصالح مرسلہ کی شرعی حجیت

استحسان کی حجیت میں فقہاء کے درمیان مشہور اختلاف ہے: احناف اور مالکیہ اسے باقاعدہ دلیل مانتے ہیں، امام مالک کے بارے میں یہاں تک منقول ہے کہ استحسان علم کا اکثر حصہ ہے، جبکہ شافعیہ نے اس کی تردید کی ہے۔ تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کی شدت اصطلاحی ہے، کیونکہ شافعیہ بھی نص، اجماع اور ضرورت کی بنیاد پر قیاس سے عدول کو قبول کرتے ہیں؛ تنازع صرف قیاس خفی کو استحسان کا نام دے کر مستقل دلیل بنانے پر ہے۔ مصالح مرسلہ کی حجیت میں بھی اسی طرح کا اختلاف ہے: مالکیہ اور حنابلہ اسے مضبوط دلیل مانتے ہیں، امام غزالی جیسے شافعی اصولیوں نے اسے سخت شرائط کے ساتھ قبول کیا ہے، جبکہ ظاہریہ اور بعض دیگر علماء نے اسے رد کیا ہے۔ اس کا انکار کرنے والوں کا خدشہ یہ ہے کہ مصلحت کے نام پر شریعت میں من مانی داخل ہو جائے گی، جبکہ ماننے والوں کا جواب یہ ہے کہ سخت شرائط کے ساتھ یہ خطرہ ختم ہو جاتا ہے اور بغیر اس اصول کے نئے مسائل کا حل ممکن نہیں رہتا۔ دونوں اصولوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ انہیں قطعی نصوص کے دائرے سے باہر اور ظنی اجتہادی میدان میں استعمال کیا جاتا ہے، اسی لیے ان پر مبنی احکام بھی اجتہادی احکام کا درجہ رکھتے ہیں۔

مقاصد شریعت: ضروریات، حاجیات اور تحسینیات

مقاصد شریعت سے مراد وہ حکمتیں اور غایات ہیں جن کے حصول کے لیے احکام شریعت مقرر کیے گئے ہیں۔ امام غزالی اور امام شاطبی نے استقراء نصوص سے ثابت کیا ہے کہ شریعت کا مقصد بندوں کی دینی و دنیوی مصلحتوں کی حفاظت ہے، اور یہ مصلحتیں تین درجات میں تقسیم ہوتی ہیں۔ پہلا درجہ ضروریات ہے، یعنی وہ امور جن کے بغیر دینی و دنیوی نظام درہم برہم ہو جائے۔ ضروریات خمسہ یہ ہیں: دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، عقل کی حفاظت، نسل کی حفاظت اور مال کی حفاظت۔ نماز و جہاد جیسے احکام دین کی حفاظت کے لیے، قصاص جان کی حفاظت کے لیے، شراب کی حرمت عقل کی حفاظت کے لیے، نکاح و حدود زنا نسل کی حفاظت کے لیے اور چوری کی حد و تجارت کے احکام مال کی حفاظت کے لیے مقرر ہوئے ہیں۔ دوسرا درجہ حاجیات ہے، یعنی وہ امور جن کی ضرورت تو ہے مگر ان کے بغیر نظام ختم نہیں ہوتا، البتہ تنگی اور مشقت پیدا ہوتی ہے؛ سفر و بیماری میں رخصتیں، قرض و اجارے کے معاہدات اور ضرورت کے پیش نظر ممنوع چیزوں کی محدود اجازت اسی درجے میں آتی ہے۔ تیسرا درجہ تحسینیات ہے، یعنی وہ امور

جو زندگی کو خوشگوار، مہذب اور خوبصورت بناتے ہیں، جیسے پاکیزگی وطہارت کے آداب، خوش اخلاقی، کریم النفسی اور کھانے پینے ولباس کے شرعی آداب۔ ترتیب یہ ہے کہ ضروریات پر حاجیات کو اور حاجیات پر تحسینیات کو قربان کیا جاسکتا ہے، اس کے برعکس نہیں ہو سکتا۔

جدول 1: مقاصد شریعت کے درجات اور مثالیں

مثالیں	مفہوم	درجہ
دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت کے احکام	نظام دین و دنیا کی بقا کے لیے ناگزیر	ضروریات
سفر و مرض کی رخصتیں، قرض و اجارے کے عقود	تنگی و مشقت دور کرنے کے لیے مطلوب	حاجیات
طہارت کے آداب، خوش خلقی، اچھا لباس و گفتگو	حسن و جمال اور مکارم اخلاق کے لیے	تحسینیات

مصالح مرسلہ پر عمل کی شرائط

مقاصد شریعت کو مد نظر رکھتے ہوئے علماء نے مصالح مرسلہ پر عمل کے لیے سخت شرائط مقرر کی ہیں تاکہ یہ اصول نظم شریعت کا حصہ رہے، اس سے باہر نہ نکلے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ مصلحت حقیقی ہو، وہمی یا مفروضہ نہ ہو؛ یعنی اس کا فائدہ یقینی یا غالب ظن کی حد تک ثابت ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مصلحت عام ہو، کسی فرد یا طبقے کی ذاتی خواہش کو اجتماعی مصلحت کا نام نہ دیا جائے۔ تیسری شرط سب سے اہم ہے کہ مصلحت کسی قطعی نص یا اجماع کے معارض نہ ہو، کیونکہ نص کے مقابلے میں مصلحت کا دعویٰ باطل ہے۔ چوتھی شرط امام غزالی نے یہ لگائی کہ مصلحت ضروری درجے کی ہو، یعنی ضروریات خمسہ میں سے کسی کی حفاظت سے متعلق ہو، اور قطعی و کلی ہو؛ بعد کے علماء نے اس شرط میں مناسب وسعت پیدا کی اور حاجیات کے درجے کو بھی شرائط کے ساتھ شامل کیا۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ مصلحت پر عمل سے اس سے بڑی خرابی پیدا نہ ہو، کیونکہ ضرر کو ضرر سے دور نہیں کیا جاتا اور مصلحت و مفسدت کے موازنے میں مفسدت کے غلبے کو روکا جاتا ہے۔ چھٹی شرط یہ ہے کہ عبادات اور مقررہ مقداروں جیسے تعبدی امور میں مصالح

مرسلہ کو داخل نہ کیا جائے، کیونکہ ان کی بنیاد توقیف ہے عقل کی مصلحت بینی نہیں؛ اس کا دائرہ معاملات اور اجتماعی نظم و نسق ہے۔ ساتویں شرط یہ ہے کہ اس پر عمل کا فیصلہ اہل علم و اجتہاد کی اجتماعی غور و فکر سے ہو، کیونکہ اتنے نازک اصول کو انفرادی پسند کے سپرد کرنا خود ایک مفسدت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ استحسان قوی تر دلیل کی بنا پر ظاہر قیاس سے عدول کا نام ہے، اس کی اقسام نص، اجماع، ضرورت، عرف اور قیاس خفی کی بنیاد پر بنتی ہیں، جبکہ مصالح مرسلہ وہ غیر منصوص مصلحتیں ہیں جو شارع کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں۔ مقاصد شریعت کے تین درجات ضروریات، حاجیات اور تحسینیات نے ان دونوں اصولوں کو ایک مضبوط فریم ورک فراہم کر دیا ہے، اور مصلحت کے حقیقی، عام، غیر معارض للنص اور ضروری ہونے جیسی شرائط نے اسے من مانی سے بچا لیا ہے۔ ان اصولوں کا درست استعمال شریعت کی روح کی حفاظت بھی ہے اور اسے ہر دور میں قابل عمل رکھنے کا ذریعہ بھی، بشرطیکہ طالب علم ان کے ساتھ علمی احتیاط اور اہل علم کی رہنمائی کو ہمیشہ لازم رکھے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com